© rasailojaraid.com

مفتی صاحب کی یادیں

تحریر: الحاج احمد سعید ملیح آبادی (مدیر "آزاد ہند" کلکتہ)

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب اپنے دم سے ایک عہد تھے وہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن اور ادارہ تھے دہلی میں "ندوۃ المصنفین" کے نام سے انھوں نے جو علمی ادارہ قائم کیا اس نے دین و ملت کی زبردست خدمت انجام دی۔ اس ادارے سے بہت سی عمدہ، مفید اور قیمتی کتابیں شائع کی گئیں، "ندوۃ المصنفین" صرف ایک اشاعتی ادارہ نہیں رہا، مفتی صاحب کی حیات میں یہ علم و فضل کا ایک مرکز بھی تھا، جہاں علماء و فضلاء کی نشستیں اور مجلسیں جمتیں، مفتی صاحب مرحوم کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا ادنیٰ سے اعلیٰ تک سب ان کے تعلقات یکساں گہرے اور مخلصانہ ہوتے تھے، مفتی صاحب سے ملنے "ندوۃ المصنفین" میں بڑے بڑے لوگ آیا کرتے اور مفتی صاحب بھی لوگوں سے ملنے جاتے کبر و تکلف چھو نہیں گیا تھا، سادہ زندگی، ہر کسی کے ساتھ خوش کلامی، مرنجاں مرنج، نکتہ رس معاملہ فہم، دقیقہ سنج، شگفتہ مزاج، علوم دینیہ پر گہری نظر، نپی تلی رائے، ملکی اور قومی حالات سے پوری طرح باخبر، صرف دُور کے تماشائی نہیں خود بھی سیاست کے بحر ذخار کے شناور، اعلیٰ پائے کے خطیب، مجلسی گفتگو میں اپنے ملائم اور نکتہ رس انداز کلام سے چھا جانے والے اور دلوں کو موہ لینے والے، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

مفتی صاحب کے ساتھ میرا بھی نیازمندانہ اور عزیزدارانہ تعلق تھا، مرحوم ہمیشہ شفقت کا برتاؤ رکھتے تھے والد مرحوم مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور مفتی صاحب مرحوم کے بیچ گہرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے، بعض امور میں ہم رائے نہ ہونے کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی محبت میں سرشار تھے اور باہمی احترام و اعتماد کا جذبہ رکھتے تھے ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۸ء تک مولانا ملیح آبادی مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ساتھ دہلی میں رہے، ان دنوں ملیح آبادی صاحب انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے عربی مجلہ "ثقافۃ الہند" کو ایڈیٹ کرتے تھے اور آل انڈیا ریڈیو کے عربی یونٹ کو دیکھتے تھے، جامع مسجد دہلی میں نماز جمعہ کے بعد مفتی عتیق الرحمن صاحب کے ہاں علماء و فضلاء کی محفل جمتی، کبھی کبھی دوپہر کا کھانا بھی وہیں ہوتا جس کا اہتمام قاضی سجاد حسین صاحب کرتے، عصر تک یہ مجلس رہتی پھر سب رخصت ہو جاتے،

والد مرحوم ملیح آبادی کے تعلق سے میرے ساتھ مفتی صاحب کا برتاؤ اسی بناپر مربیانہ اور مشفقانہ تھا، دہلی جانا ہوتا تو مفتی صاحب کو سلام کرنے حاضری دینا ضروری تھا بار بار اصرار کر کے کھانا ساتھ کھلاتے، گھر بار کے احوال دریافت کرتے احباب اور واقف کاروں کی خیریت پوچھتے ملکی اور قومی مسائل پر گفتگو فرماتے یہ احساس نہ ہونے دیتے کہ ہمارے درمیان خوردی اور بزرگی کا رشتہ ہے پوری توجہ سے بات سنتے بات کو اہمیت دیتے رائے مختلف ہوتی تو اس کا اظہار بڑے ہی نفیس اور سلجھے ہوئے انداز میں کرتے تاکہ خود اعتمادی کو ٹھیس نہ لگے اپنے اوپر کسی تنقید کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے، کسی بات سے درگذر کرنا ہوتا تو ایک لمبی سی "جی ہاں" کہہ کر خاموش ہو جاتے، تخاطب میں کبھی "تم" کا صیغہ استعمال نہ کیا، ہمیشہ آپ کہہ کر خطاب فرماتے (بزرگ اپنے چھوٹوں کو ادب اسی طرح سکھاتے تھے کہ پہلے خود ادب کرتے تھے) رخصت کرنے والان سے اٹھ کر دروازے تک پہنچانے آتے کیا شفقت تھی، کیا انکساری تھی، ـــ مرحوم کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی، جو ذہانت کی علامت تھی۔ اپنے دوست مولانا ملیح آبادی کو یاد کر کے ہمیشہ ہی ایک لمبی ٹھنڈی سانس ضرور لیتے اس وقت انکی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ جاتی ایسا لگتا کہ ساری محبت امنڈ کر آنکھوں میں اتر آئی ہے، ـــ جون ۱۹۷۵ء کی بات ہے ایمرجنسی لگی اور ساتھ میں اخباروں پر سنسر بیٹھا تو اس وقت دہلی سے تمام ایڈیٹروں کا بلاوا آگیا دہلی پہونچے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو دیکھا، دہلی بھائیں، بھائیں کر رہی ہے، ہر طرف سناٹا، ہُو کا عالم گرفتاریوں اور سخت گیری کی دہشت طاری اسی عالم میں جامع مسجد کے علاقے میں جانا ہوا تو وہاں بھی ایسی ہی کیفیت پائی، مفتی صاحب کے ہاں بھی ماحول بدلا ہوا تھا، تنہا بیٹھے تھے، دیکھ کر خوش ہو گئے، اسی بیچ میں محمد یونس خاں کا ٹیلی فون آگیا اور ان کے ساتھ مفتی صاحب کی تیز لہجے میں جو گفتگو ہوئی وہ ایمرجنسی کے ماحول سے جدا کوئی چیز تھی، مفتی صاحب اپنے کئی ساتھیوں کی گرفتاری اور نظر بندی پر سخت برہم تھے اور یونس خاں کو زور زور سے پھٹکار رہے تھے کیونکہ وہ مسز گاندھی اور سنجے گاندھی سے بہت قریب تھے جب ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی تھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ خود وہ کب پکڑ لیا جائیگا اور ایمرجنسی لگائی اسی لیے گئی تھی کہ زبان بندی ہو، حکومت کے خلاف تحریر و تقریر اور سیاسی سرگرمی سب بند، مگر ایک بوڑھا، کمزور اور ناتواں مولوی اپنے ٹھکانے پر تن تنہا بیٹھا حکومتِ وقت کو آنکھیں دکھا رہا تھا، اور کڑے لہجے میں سخت و سست کہہ رہا تھا یہ تھی شان مفتی عتیق الرحمٰن کی، یہ جرأت، یہ بے باکی، یہ حق گوئی اور شانِ بے نیازی اسی انسان میں پیدا ہو سکتی ہے جو سچا اور کھرا ہو، جس کے اندر ایمان کی حرارت ہو اور قوم و وطن کے جذبے سے دل لبریز ہو مفتی عتیق الرحمٰن کا تعلق بنیادی طور پر جمعیۃ العلماء ہند سے تھا کیونکہ وہ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھتے تھے استقلالِ وطن کی خاطر جاں بازی انھیں اپنے خاندان اور بزرگانِ دین سے ملی تھی، جنگ آزادی کے وہ ایک نڈر سپاہی تھے، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کے رفیقِ کار بلکہ دستِ راست تھے ۱۹۴۷ء کے دورِ ابتلاء و آزمائش کے بعد گلی قاسم جان میں جمعیۃ العلماء ہند کا دفتر مظلوموں کے کیمپ میں تبدیل ہو چکا تھا جس میں مولانا حفظ الرحمٰن صبح سے رات گئے تک مسلسل کام کرتے لگاتار بولتے اور بگڑتے الجھتے رہتے اس وقت مفتی صاحب انکی تقویت اور صلاح کاری کے لئے پاس موجود رہتے اکابرینِ قوم و ملت سے مفتی صاحب کے گہرے تعلقات تھے، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو مولانا ابوالکلام آزاد، لال بہادر شاستری، ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رفیع احمد قدوائی، شیخ محمد عبداللہ، فخرالدین علی احمد، مسز اندرا گاندھی وغیرہ سے مفتی صاحب کے قریبی تعلقات تھے اور یہ حضرات انکی عزت کرتے تھے اور انکی رائے پر سنجیدگی سے دھیان دیتے تھے، ایک مرتبہ سرینگر میں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ملکی و ملی حالات پر میری تفصیلی گفتگو ہو رہی تھی بات چیت میں کوئی ایسا سوال آیا جس کا فوری جواب شیخ صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا تو فرمایا دہلی جاؤں گا تو مفتی صاحب سے مل کر بات کروں گا اور طے کروں گا۔"

مفتی صاحب کی وفات پر وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے جو تعزیتی پیغام جاری کیا تھا اس میں بھی جذبات موجود تھے علالت کے دوران بھی مسز گاندھی برابر مزاج پرسی کرتی رہیں اور آل انڈیا میڈیکل اینڈ سائنس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کچھ عرصہ رکھکر ان کا علاج بھی کروایا آخر ۸۳ سال کی عمر میں قضا نے اپنا کام کیا اتنی عمر آدمی کے جینے کے لئے بہت سمجھی جاتی ہے مگر کام کے آدمی کے لئے یہ عمر بھی طبعی نہیں اور اس کے اٹھنے سے کارجہاں میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔

مفتی صاحب مرحوم ملت بیضاء کی شمع تھے ان کے رخصت ہونے سے یہ ایک روشن چراغ بھی گل ہوا اندھیرا اور بڑھ گیا، ان کے دم قدم سے دنیائے علم و ادب میں جو رونق تھی وہ سونی پڑ گئی۔ ایک قیمتی متاع تھی جسے موت ساتھ لے گئی، ملت مسلمہ کا یہ ناقابل تلافی نقصان ہوا جب ان کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی تب ہی وہ نہ رہے مسلم مجلس مشاورت کے صدر کی حیثیت سے مفتی صاحب نے اپنے بس بھر ملت کی خدمات کی بعض وجوہ سے مسلم مجلس مشاورت کی کارکردگی کا دائرہ وسیع اور موثر نہ ہو سکا، مفتی صاحب کو شدت سے اس کا احساس تھا انھیں ایک ایسے پلیٹ فارم کی ضرورت تھی جہاں سے وہ ملت مسلمہ کی شیرازہ بندی کرسکیں جمعیۃ علمائے ہند میں گروہی سیاست کی وجہ سے اسکے دروازے ان پر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے تھے کچھ عرصہ وہ جمعیۃ کے کارگذار صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے مگر یہ بندوبست چل نہ سکا اور انھیں کنارے ہونا پڑا جمعیۃ کی گروہی سیاست سے مفتی صاحب کو رنج تو بہت تھا مگر اس کا اظہار کبھی کھل کر نہیں کرتے تھے اور نہ کسی شخص کے بارے میں کوئی ایسی بات زبان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے نکلتے جو اس شخص اور مفتی صاحب کے اپنے مقام و مرتبہ کے خلاف ہو۔

ایک مرتبہ مسلم مجلس مشاورت کے بارے میں گفتگو چلی تو مفتی صاحب نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ وہ ایک ایسی تنظیم کے صدر ہیں جسکا عملاً کوئی وجود نہیں مجلس مشاورت میں شریک ہر جماعت اس پلیٹ فارم کو صرف اپنی مقصد براری کیلئے استعمال کرتی ہے اور اس سے زیادہ سروکار نہیں رکھتی۔ ان دونوں جماعت اسلامی کی سرگرمیاں بڑھی ہوئی تھیں اور جماعت نے مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم اور اسکے مقتدر و محترم صدر کی ذات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ استحصال کیا ایمرجنسی اٹھنے کے بعد جماعت اسلامی کے متعلقات آر ایس ایس اور آنند مارگ کے ساتھ گہرے ہو گئے تھے، اسکی وجہ سے مفتی صاحب کو ایک مستقل ذہنی کوفت تھی اور انھیں تکلیف اٹھانا پڑتی تھی مفتی صاحب ایسے وضعدار آدمی تھے کہ اس تکلیف دہ صورت حال کو بھی ضبط و تحمل سے برداشت کرتے رہے وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو بات بات پر ترک تعلق کر کے الگ کھڑے ہو جاتے ہیں ۔مفتی صاحب آخر تک اصلاحِ حال کی کوشش کرتے رہے اور کامیاب ہوئے جماعت اسلامی والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ آر ایس ایس اور آنند مارگ کی کھلی دوستی سے تائب ہو کر ٹھنڈے پڑ گئے۔

مفتی صاحب نے اپنی پبلک زندگی کا آغاز کلکتہ سے کیا تھا اور زندگی بھر کلکتہ کو نہیں بھولے غالب کی طرح مفتی صاحب کو بھی کلکتہ تمام عمر عزیز رہا، اور اسکی یاد ان کے دل میں باقی رہی غالب کو تو ایک بار کے سوا دوبارہ کلکتہ آنا نصیب نہ ہوا، مفتی صاحب سال کے سال کلکتہ ضرور آتے بیمار اور کمزور ہوتے تب بھی کلکتہ آجاتے اور یہاں آکر آرام و سکون محسوس کرتے کولوٹولہ میں حاجی مقبول احمد صاحب (سگریٹ والوں) کے گھر اترتے اور وہاں مہمان کے بجائے اپنے گھر کی طرح سکون سے رہتے، احباب سے فرداً فرداً ملنے ان کے گھر یا دفتر جاتے مولانا حکیم محمد زماں صاحب حسینی کا مطب مستقل نشست گاہ بنتی جن دنوں مفتی صاحب کلکتہ میں مقیم ہوتے تو حکیم صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا مطلب احباب اور عقیدت مندوں سے بھرا رہتا ایک اٹھتا تو چار آ کر بیٹھ جاتے ہر قسم کی مجلسی گفتگو ہوتی پرانی یادیں تازہ ہوتیں اور لوگوں کو مفتی صاحب سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا یہ سلسلہ سال بہ سال جاری رہا اور اس وقت منقطع ہوا جب فالج کے عارضے سے معذور ہو کر انھیں دہلی میں صاحب فراش ہو جانا پڑا ہم لوگ کہتے بھی کہ "مفتی صاحب اب اس عمر میں اور بیماری کی نقاہت میں آپ اتنا لمبا سفر کر کے نہ آیا کریں" فرماتے "یہاں آ کر ہی تو میں تازہ دم ہوتا ہوں" مفتی صاحب نہیں رہے مگر انکی باتیں رہ گئیں ہیں جو کبھی ختم نہ ہوں گی کچھ لوگ دنیا میں اپنے پیچھے اتنا کچھ چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کی یاد مٹائے نہیں مٹتی۔ آنکھیں اب بھی انھیں ڈھونڈتی ہیں اور ان کی ضرورت اب بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ خاص کر ان دنوں میں جب ہوا زیادہ گرم ہو جاتی ہے مفتی صاحب کی رفاقت اور قیادت بہت یاد آتی ہے دل اندر سے پکار اٹھتا ہے "کاش مفتی صاحب اس وقت ہوتے تو ان کے پاس چلتے، وہ آڑے وقت میں کام آتے ملت کی کشتی آج بھی بھنور میں ہچکولے کھا رہی ہے" ناخدا نہ رہا"

نذرِ برہان

محمد سلیمان ظفر القاسمی

ان کی ذات سے وابستہ جو ایک "برہان" ہے

اسکو قائم و دائم رکھنا اب ہمارا کام ہے

جان بھی دیدیں گے ہم اس ادارہ کی بقا کے واسطے

جس کا رہبر جس کا قائد آج "عمید الرحمن" ہے

آؤ مل کر آج باہمی اتحاد ہم قائم کریں

عمر بھر کرتے رہیں یوں خدمت "برہان" ہے

یہ دعا ہے آج ہر طالب ظفر میں

کامیابی، کامرانی یوں باہمی قائم رہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفتی صاحب کی یاد میں

پرنس ڈاکٹر یوسف نجم الدین[1] مرحوم

ہندوستان اور پاکستان میں اُن کے جاننے اور ماننے والے تو لاکھوں کی تعداد میں ہیں، لیکن کم لوگوں کو اندازہ ہوگا کہ مفتی عتیق الرحمن عثمانی کے اٹھ جانے سے مسلمانانِ ہند کی زندگی میں کون سا کس قسم کا خلا پیدا ہوگیا۔

مفتی صاحب اُن علمائے دین کے وارث تھے جن کے نزدیک دین فروعی اختلاف اور فقہی نزاع کا نام نہیں رہا ——— وہ ارکانِ دین کی شرکت و اتفاق پر نظر رکھتے تھے۔

مفتی صاحب مرحوم اسلامی تاریخ کے اُن علمائے سَلَف کی ایک زندہ یادگار تھے جو مسلمانوں کے عروج و زوال کے رموز سے آگاہ ہو چکے تھے اور خوب سمجھتے تھے کہ وہ کیا اسباب و علامات ہیں جن سے حذر لازم ہے اور جن سے محتاط ہو کر چلنے میں حالاتِ حاضرہ کا سامنا کیا جاسکتا ہے۔

مفتی صاحب شرعی احکام اور فتاویٰ کو اپنی شخصیت اور اَنا کے فروغ کے لئے نہیں، بلکہ دین کے استیلا اور استقرار کے لئے لازم گردانتے تھے۔

زندگی کے کم و بیش چالیس سال انھوں نے فتاویٰ لکھے اور نہ صرف "استفسار کے باب" کو مطمئن کیا بلکہ حامیوں اور مخالفوں میں بھی اپنے بے غرض اور بے نفس ہونے کو تسلیم کرالیا۔

---

[1] افسوس کہ اس مضمون کی اشاعت سے پہلے پرنس ڈاکٹر یوسف نجم الدین کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ (عمید الرحمن عثمانی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفتی صاحب ایک نہایت اصولی، راست گو، راست باز، حق پسند اور مرنجاں مرنج طبیعت کے نیک سیرت بزرگ تھے۔ سلامتِ طبع کی نعمت انھیں وافر ملی تھی اور اسی سبب سے وہ مخالفت کے طوفان اور حالات کے ہیجان میں بھی کبھی تناسب و توازن سے محروم نہیں ہوتے۔

مفتی صاحب مرحوم اپنوں اور بیگانوں کو کھلے دل سے داد دینے میں بڑے فیاض واقع ہوئے تھے۔ طلاقۃ الوجہ (چہرے کی بشاشتی) ایمان کی نشانیوں میں سے ہے۔ مفتی صاحب کو یہ نشانی، بلکہ روشن نشانی میسر تھی جس کی برکت سے وہ وہ اہلِ علم، اہلِ قلم اور دیندار جو بعض اوقات ان سے اختلاف بھی کرتے تھے اُن کی اِس خوبی سے ضرور متاثر ہوتے تھے، مفتی صاحب کے دل میں کسی سے کینہ نہ تھا اور یہی ایک وجہ کافی تھی طلاقۃ الوجہ کے لئے۔

مفتی صاحب کی ایک بڑی صفت یہ تھی کہ وہ خوب و زِشت، سفید و سیاہ، دائیں اور بائیں جانب، سب طرف نظر رکھتے تھے۔ کسی سمت پر ان کی آنکھیں بند نہ تھیں۔ وہ حج و زیارات کے لئے گئے۔ علمائے باعمل کی صحبت سے مشرف رہے۔ اور سوویت یونین کے معروف لامذہب مرکزوں کی سیر کی۔ وہاں بھی انھوں نے نگاہ کھلی رکھی اور سیاحت کے بعد اپنے تاثرات اِس خوبی سے ظاہر کیے کہ دوست دشمن سبھی کو غور کرنا پڑا۔ اُن کی نیت پر کسی صاحب نظر نے کبھی شبہ نہیں کیا۔ اُن کی شخصیت ترغیباتِ دنیاوی سے بلند تھی۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وہ کسی سیاسی پارٹی سے باضابطہ منسلک نہیں ہوئے۔

مفتی صاحب مرحوم اختلافی مسائل میں اپنا وزن صلح پسندی اور معاملہ فہمی کی جانب رکھتے تھے۔ یہ انسانی بلکہ ایمانی صفت ان کی ذات میں یقیناً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے والدِ بزرگوار (مفتی عزیز الرحمٰن) کا ورثہ رہی ہوگی، جن کے بارے میں محبت و عقیدت نے کافی کچھ لکھا ہے، تاہم ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات نے اِس صفت کو اور بھی چمکا دیا تھا۔ "مفتی" ہونے کی بدولت وہ نزاعی اور اختلافی مسائل میں فیصلہ کن شخصیت کا درجہ رکھتے تھے، لیکن ان کا فیصلہ یا فتویٰ ہمیشہ ایسی صورت حال کی نشان دہی کرتا تھا جس میں صلح صفائی کی راہ نکلتی ہو۔ وہ صدق دل سے عموماً سبھی جاننے اور ماننے والوں کے لئے اور خصوصاً ہندستانی مسلمانوں کی خاطر اپنی ذات اور ذاتی مفاد کو ذاتی حیثیت دے کر دوسروں کی اَنا کی تسکین کرتے اور اتحاد و اتفاق کی راہوں کو روشن کر دیا کرتے تھے۔

مفتی صاحب کم سے کم الفاظ کے آدمی تھے۔ کھانے پینے میں، سونے میں، لب کشائی کرنے میں، خرچ کرنے میں، اپنی ناگواری اور خوشی کے اظہار میں وہ بہت ہی محتاط انسان تھے۔ شاید ہی کسی نے اُن کو حدود سے گزرتے دیکھا یا سنا ہو۔

۱۹۴۷ء میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم کے مکان، اثاثۃ البیت اور ادارۂ "بُرہان" پر جو مصیبت آئی، جو کچھ بربادی انھوں نے سہی، سالہا کی محنت مشقت کا جو حاصل تباہ ہوا، اس کے بعد صبر و قناعت، ہمت و استقامت کا دامن جو انھوں نے تادمِ آخر تھامے رکھا ــــ وہ کچھ انہی کا حصہ تھا۔ وہ ذاتی مسائل اور مصائب کا بیان زبان پر لانا پسند نہیں کرتے۔ خدا جانے کن کن مشکلات سے دوچار ہوئے ہوں گے لیکن اُن کی استقامت دیکھ کر دوسروں کو حوصلہ ہوتا تھا۔ خوف و حزن کی تاریکی دُور ہوتی تھی۔

ہمارے خاندان اور مفتی صاحب کے درمیان ایک پُرخلوص رشتہ کم و بیش چالیس سال پہلے قائم ہوا اور، مسلک کے اختلاف کے باوجود کوئی لمحہ ایسا نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیا جس میں ہم نے ایک دوسرے سے بے تکلف تبادلۂ خیال نہ کیا ہو اور اتفاق و اتحاد کی راہ نہ مل گئی ہو۔ وہ ہمارے دفتر (بدری محل، بمبئی) اور مکان سیفی محل میں تشریف لاتے۔ علمی مجالس میں شریک ہوتے۔ اپنی لب کشائی سے ہر محفل کو وقار بخشتے اور ہمارے بزرگوں کا احترام کرتے۔ خورد وکلاں سبھی ان کی صحبت سے فیض یاب ہوا کرتے تھے۔ بمبئی میں سیکڑوں اہلِ ثروت اور اربابِ تجارت اُن کے مُرید و معتقد تھے، مگر وہ سادگی کے ساتھ مہماں نوازی قبول کرتے اور اگر دو دن بھی یہاں قیام رہتا تو وضعدار بزرگوں کی آن برقرار رکھتے ہوئے کم از کم ایک وقت کا ماحضر ہمارے ساتھ تناول فرماتے۔ یہی وقت ہوتا تھا جب ان کی حسِ مزاح اور شگفتگیِ طبع کا فیض ہم بھی اٹھاتے تھے۔ ان کی بے تکلفی میں احتیاط، برتاؤ میں مروت، نگاہ میں گہرائی طبیعت میں معاملہ فہمی اور مسائل میں دُور اندیشی آپ اپنی مثال تھی۔ کئی صفات کا ایک ذات میں اس طرح مجتمع ہوجانا اور مشکل کے وقت میں اس کا ظاہر ہونا۔ یہ ہے وہ دولت جو ان کی وفات کے ساتھ ہم سب نے کھوئی ہے اور ان کے بعد خلا کا احساس ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفتی صاحب کی زندگی کے چند گوشے

از قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

اسلام نے کسی شخص کی عظمت کا دار و مدار اس کے علمی و عملی کمالات، اللہ تعالیٰ سے اس کے متعلق اور اس کی دینی خدمات پر رکھا ہے چنانچہ فرمایا گیا

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔ تقویٰ کے معنی صاحب مرقاۃ ملا علی قاریؒ نے علم و عمل کی یکجائی کے لیے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی، اسلام نے نسبی عظمت کا بھی انکار نہیں کیا ہے چنانچہ فرمایا گیا

الناس معادن کمعادن الذھب والفضۃ خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا (الحدیث)

انسان بھی اپنے اوصاف و کمالات کے لحاظ سے سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح ہیں۔ جو لوگ زمانہ قبل اسلام میں اپنے اوصاف کے لحاظ سے بہتر سمجھے جاتے تھے وہ زمانہ اسلام میں بھی بہتر سمجھے جائیں گے۔ بشرطیکہ دین میں سمجھ رکھتے ہوں۔

مقصد یہ ہے کہ انسان کی نسبی عظمت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ اگرچہ وہ ایسے وقت معتبر ہوگی جب وہ دینی اعتبار سے بھی بلند مرتبہ ہو، یہ بات عقلی اعتبار سے بھی صحیح ہے۔ جن خاندانوں میں علم، عمل، شجاعت، ذہانت یا کوئی وصف باپ دادا‌ؤں سے چلا آتا ہو اولاد بھی اس سے ضرور حصہ پاتی ہے۔ کیونکہ فرد کی جسمانی یا روحانی صلاحیتیں بہتر ماحول ہی میں ابھرتی ہیں۔ بچہ جن لوگوں میں نشو و نما پاتا ہے ان ہی کے اوصاف و خصائل سے وہ متصف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتا ہے ۔چنانچہ مثل مشہور ہے "شیر کا بچہ شیر ہی ہوتا ہے "

بہر حال اصل چیز تو دینی و روحانی صلاح ہے مگر اس کے پنپنے اور درجہ کمال تک پہنچنے کے لیے ماحول اور خاندان بہت کچھ موثر ہوتا ہے ۔خلافت کے لیے جو قریش خاندان کی شرط لگائی گئی اور فرمایا گیا ،

لا یزال ھٰذا الامر فی قریش ما بقی منھم اثنان ۔ خلافت قریش ہی میں رہے گی جب تک ان میں دو آدمی بھی اس کی اہمیت رکھنے والے رہیں گے ۔

تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس زمانہ میں خاندان قریش اپنی عزت و شوکت کے اعتبار سے سارے عرب میں ممتاز و مفتخر تھا ۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو بنانے اور اس کے اخلاق و اعمال کو سنوارنے میں اور اس کو عزت و عظمت کے مقام پر پہنچانے میں اسلامی نقطۂ نظر سے بھی خاندانی اثرات کا بہت کچھ دخل ہوتا ہے ۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارے ممدوح حضرت مفتی صاحب بڑے خوش نصیب تھے ۔قرنوں پہلے کے بزرگوں سے تو مجھے اس وقت تعرض نہیں کرنا ۔البتہ سو برس پہلے کی تاریخ میں مفتی صاحب کے بزرگ آسمان علم و عمل پر روشن ستاروں کی طرح جگمگاتے نظر آرہے ہیں ۔

آپ کے جد امجد حضرت مولانا فضل الرحمان صاحبؒ دیوبند کے ممتاز عالم اور دار العلوم کے بانیوں میں سے ایک تھے ،حضرت نانوتویؒ کے دست و بازو تھے اور دار العلوم کے ابتدائی ارکان شوریٰ میں ان کا ایک امتیازی مقام تھا ۔

مفتی صاحب کے والد بزرگوار ،حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحبؒ ہندوستان کے نامور عالم ،ممتاز فقیہ ، دار العلوم کے مفتی اعظم اور آسمان سلوک و معرفت کے ایک نیر درخشاں تھے ۔آپ کے مرید ہندوستان اور بیرون ہند ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے تھے ۔آپ کے ایک حقیقی چچا دار العلوم کے ایک سابق مہتمم حضرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب ہندوستان کے نامور عالم، ممتاز فقیہ، دارالعلوم کے مفتی اعظم اور آسمانِ سلوک و معرفت کے ایک نیرّ درخشاں تھے۔ آپ کے مرید ہندوستان اور بیرون ہند ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے تھے۔ آپ کے ایک حقیقی چچا دارالعلوم کے ایک سابق مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمان عثمانی تھے جو عربی زبان کے بہترین ادیب اور شاعر، ممتاز مورّخ اور فہم و تدبر کے لحاظ سے ملک کی مسلم شخصیت تھے۔ دوسرے چچا حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی تھے جو دارالعلوم کے صدر مہتمم، شیخ الحدیث، مفسر قرآن اور آخر میں پاکستان کے شیخ الاسلام کی حیثیت سے عالمی شہرت کے مالک رہے۔

ہمارے مفتی صاحب نے انہی بزرگوں کی آغوش میں تربیت پائی اور وہ ان کے علمی و عملی کمالات سے بہرہ اندوز ہوئے تھے۔ حضرت مفتی صاحب ان اسلاف کرام کے خلف صالح تھے۔ مگر انہوں نے کبھی ان کی قبروں کا سودا نہیں کیا۔ وہ اگر اپنے والد بزرگوار مسند بیعت و ارشاد پر بیٹھنا پسند کرتے تو بے شبہ ہزاروں لوگ ان کے آگے سر نیاز جھکا دیتے اور ان کے سامنے بھی تحف و ہدایا کی رقوم کے ڈھیر لگ جاتے مگر انہوں نے ہمیشہ اس سے احتراز کیا۔ انہوں نے ہمیشہ بزرگوں کی استخواں فروشی سے اظہار بیزاری کیا اور اپنی ذاتی صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے لیے کامیابی کی راہ نکالنے کو پسند کیا۔

دورۂ حدیث میں انہوں نے امتیازی نمبر حاصل کیے، پھر دارالعلوم میں معین المدرسین اور نائب مفتی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ مگر ڈابھیل پہنچ کر وہاں فقہ و حدیث کی اعلیٰ کتابوں کی تدریس کے ساتھ "مفتی" کی مسند بھی حاصل ہوئی اور وہاں اپنے فاضل چچا حضرت مولانا عثمانی اور شہرۂ آفاق استاد علامہ انور شاہ کشمیری کی صحبت سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ اگر وہ مسند درس و افتاء پر قناعت کرتے تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے بزرگوں کے مکمل جانشین ہوتے مگر انہوں نے اپنے لیے ایک دوسرا راستہ تجویز کیا ندوۃ المصنفین کی تاسیس:

کچھ عرصہ بعد وہ نامور ساتھی حضرت مولانا سیوہاروی کے ساتھ کلکتہ رہے۔ یہ غالباً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورہ سے ہوا۔ وہاں کی مرکزی مسجدوں میں دونوں نے درس قرآن جاری کیا پھر وہیں کے دوران قیام میں "ندوۃ المصنفین" کا خاکہ بنایا۔ کلکتہ کے بعض مخیر اصحاب نے ان کی مالی مدد کی۔ پھر دہلی آکر اپنے ساتھیوں مولانا سہواروی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے ساتھ (جو ان دنوں مدرسہ عالیہ فتحپوری میں مدرس تھے اور انگریزی کے امتحانات بھی دے رہے تھے) اس خاکہ میں رنگ بھرا۔ طبیعت میں ہمیشہ نظم و ترتیب اور سلیقہ و نفاست تھی، قرولباغ میں عیدگاہ سے متصل ایک چھوٹی مگر خوبصورت کوٹھی کرایہ پر لی۔ قیمتی فرش فروش سے آراستہ کیا۔ شیشہ کی کواڑوں والی خوبصورت الماریاں کمروں میں سجائیں خوبصورت جلدوں کی کتابیں جن پر سنہری حروف میں کتابوں کے نام لکھے ہوئے تھے ان شیشوں میں سے جھانک کر دیدہ و دل کو کھینچتی تھیں۔

اندر کے دالان میں تین چار نشستیں فرش پر قائم کی گئی تھیں جن پر رفقاء دار المصنفین جلوہ افروز ہوتے حضرت مولانا حفظ الرحمان سہواروی، رفیق اعلیٰ کی نشست درمیان میں تھی۔ ادھر ادھر مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدیر برہان، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا عبدالرشید نعمانی اور اس خاکسار کی نشست تھی۔ مجھے انہوں نے بالکل شروع ہی میں رفاقت مجلس کی دعوت دی تھی میں مستقل طور پر تو نہیں مگر مہینے میں کئی کئی روز وہاں رہتا اور رفقاء کرام کی علمی و ادبی و مجلسی صحبتوں سے محظوظ ہوتا۔

مفتی صاحب کے حسن انتظام و تدبر اور مولانا سہواروی کی علمی و سیاسی شہرت کی وجہ سے ندوۃ المصنفین بہت جلد ہندوستان میں مشہور ہو گیا۔ ابناء دار العلوم نے دار العلوم کے ایک ضمنی ادارہ کی حیثیت سے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ اگرچہ دار العلوم، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی جیسے محدث جلیل اور شہرۂ آفاق ماہر سیاست کی رہنمائی میں ہندوستان کے علمی و دینی اداروں کا سرتاج تسلیم کیا جاتا تھا اور کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شک نہیں ہندوستان کے مدرسوں میں ہر جگہ اس کے فیض یاب درس و افتار کی خدمات انجام دے رہے تھے اور جمعیۃ علمار ہند کے زیر علم آزادی ہند کی تحریک میں بھی پیش پیش تھے اور اگرچہ ذاتی طور پر تصنیف و تالیف سے یہ تعلق بھی نہ تھے بلکہ ان کے ایک فرد (حضرت مولانا تھانوی رحمتہ اللہ تعالیٰ) کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد دوسرے علمی اداروں کی مجموعی تعداد سے افزوں تھی۔ مگر کوئی ایسا تصنیفی مرکز نہ تھا جہاں جماعتی طور پر تصنیفی کام کیا جا سکے۔ فرزندان دارالعلوم نے ندوۃ المصنفین کا اسی حیثیت سے خیر مقدم کیا اور بہت جلد علمی و دینی و تاریخی بلند پایہ کتابیں اس مرکز سے شائع ہو کر ملک میں پھیل گئیں۔

ندوۃ المصنفین نے ہر سال چار کتابیں اپنے معاونین کو مہیا کرنے کا اعلان کیا تھا۔ یہ کتابیں التزام کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔ اور اب حضرت مفتی صاحب کے انتقال تک ان کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ متجاوز ہو چکی تھی۔ ان میں حضرت مولانا سیوہاروی کی قصص القرآن اور اسلام کا اقتصادی نظام، مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی فہم قرآن اور مسلمانوں کا عروج و زوال اور مولانا بدر عالم میرٹھی کی ترجمان السنۃ بہت مقبول ہوئیں میری بھی تین کتابیں نبی عربی، خلافت راشدہ اور خلافت بنی امیہ ابتدائی سالوں ہی میں شائع ہوئیں جو میری اولین قلمی کاوش ہیں۔ مگر بعد میں اپنے نجی علمی کاموں کی وجہ سے اس سلسلہ کو جاری نہ رکھ سکا۔ مگر حضرت مفتی صاحب اور ادارہ سے میرا تعلق برابر قائم رہا۔

ادھر مولانا سعید احمد اکبر آبادی جو ادارہ کے ترجمان مجلہ برہان کے شروع ہی سے مدیر قرار پائے تھے، ان کے نوجوان قلم کی جولانیوں نے برہان کو ملک کے صف اول کے ماہ ناموں میں شامل کر دیا اور اس کے نظرات کی اہمیت اہل علم و نظر کے حلقوں میں تسلیم کی جانے لگی۔

جامعیت

حضرت مفتی صاحب سیاسی خیالات کے اعتبار سے کانگریسی تھے بگران کا حلقہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احباب عام تھا جس میں مسلم لیگی، احراری اور بعد میں مسلم مجلسی سب ہی شامل تھے اور سب سے مفتی صاحب کے گہرے ذاتی تعلقات تھے۔

ندوۃ المصنفین کے دفتر میں جب کانگریسی خیالات کے لوگ آتے تو ان سے گفتگو کے لیے مولانا حفظ الرحمٰن تجویز ہوتے اور جب مسلم لیگی حضرات آتے تو ان سے بات کرنے کے لیے مولانا بدر عالم صاحب کو تکلیف دی جاتی۔ دسترخوان سب کے لیے یکساں فراخ تھا۔ اس لیے ہر نقطۂ نظر کے لوگ مطمئن واپس جاتے۔

ندوۃ المصنفین کی نشأۃ ثانیہ

۱۹۴۷ء کے ہولناک فسادات سے ندوۃ المصنفین محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ شہر سے دُور غیر مسلم آبادی سے گھرا ہوا تھا۔ دفتر پر حملہ ہوا۔ اس کا خاصہ مالی نقصان بھی ہوا۔ مگر مولانا حفظ الرحمان کے سیاسی اثرات کی وجہ سے اس کا زیادہ تر اثاثہ منتقل کر دیا گیا۔ پاکستان جانے والے مسلمانوں نے جو مکانات خالی کیے تھے، جمعیۃ علماء کا ایک کام یہ بھی تھا کہ حتی الامکان انھیں مسلمانوں کو الاٹ کرائے۔ مفتی صاحب نے قرول باغ کی کوٹھی کو خالی کر کے جامع مسجد کے قریب دو شاندار مکانات (ایک دفتر کے لیے اور دوسرا اپنی رہائش کے لیے) الاٹ کرائے۔ یوں ندوۃ المصنفین اب جامع مسجد کے مرکزی علاقہ میں آگیا۔ مفتی صاحب نے اپنی حُسنِ تدبیر اور مولانا سیوہاروی کے اثرات سے کام لے کر دفتر کو نئے سرے سے منظم کیا اور نئے جوش و خروش سے دوبارہ کام جاری کر دیا۔ یہ مفتی صاحب کا دوسرا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

سادگی و بے تکلفی:-

مفتی صاحب کی ایک خاص صفت ان کی سادہ مزاجی، تواضع اور بے تکلفی تھی۔ ان کو کھانا پکانے اور مل جل کر کھانے کا طالبعلمی ہی کے زمانہ سے شوق تھا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے دہلی کی شاہی جامع مسجد کے سامنے ناز ہوٹل والی عمارت میں 'ادارہ مشرقیہ' کے نام سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک مرکز قائم تھا جس میں منشی فاضل وغیرہ کی پرائیویٹ تیاری کرائی جاتی تھی ۔ مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی (حال صدر مدرس جامعہ عربیہ بنوری ٹاؤن، کراچی) اس کے کرتا دھرتا تھے ۔ ہر جمعرات کو وہاں مخصوص احباب جمع ہوتے ۔ مرغ ذبح کیا جاتا مولانا حفظ الرحمان اس کا گوشت بناتے ۔ مفتی صاحب مصالحہ پیستے اور پکاتے ۔ دوسرے رفقا بھی ہاتھ بٹاتے، کوئی آگ دہکاتا، کوئی برتن دھوتا ۔ غرض حدیث میں جو واقعہ آتا ہے کہ کسی غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام بکری پکانے بیٹھے تو کسی نے اس کی ذبح کی ذمہ داری لی ۔ کسی نے کھال اتاری اور گوشت بنایا ۔ کسی نے اسے پکایا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ میں لکڑیاں جمع کر کے لاؤں گا اس کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ۔ مجھے بارہا اس مجلس احباب میں شرکت اور کام و دہان کی لذت کے ساتھ دل و دماغ کی فرحت حاصل کرنے کا موقع ملا ہے

یہ مجلس جمعہ کے دن ہی جمتی اور اس میں چائے کا دور چلتا ۔ جب مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ تعالیٰ سفر یورپ و روس سے واپس آکر جامعہ ملیہ دہلی میں بیت الحکم بنا کر فروکش ہوئے تو وہ بھی جمعہ والی مجلس میں شریک ہوتے بلکہ حجۃ اللہ البالغہ کی اپنے مخصوص علمی و سیاسی انداز میں تعلیم بھی دیتے ۔

حضرت مولانا کی سیر یورپ و روس وغیرہ نے، اور عالم اسلام میں مسلمانوں کی پسماندگی اور ان کے اختلافات نے مولانا کے خیالات میں بڑا مد و جزر پیدا کر دیا تھا ۔ ان کے مزاج میں بڑی یبوست اور نزاکت آگئی تھی ۔ ذرا ذرا سی خلافِ مرضی بات پر بگھر جاتے اور مخاطب کو مجلس سے اٹھا دیتے ۔ مولانا بشیر احمد کٹھوری بڑے دلچسپ اور بذلہ سنج آدمی تھے بڑی متین اور سنجیدہ صورت بنا کر مولانا سے ایسے سوالات کرتے جس سے وہ چیں بہ جبیں ہو جاتے اور مجلس مذاکرہ معرکہ کارزار بن جاتی ۔ مگر مولانا سندھی کا مزاجی تلاطم جلد ہی پرسکون بھی ہو جاتا اور پھر سنجیدگی سے اپنی گفتگو شروع کر دیتے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابتدا میں ایک روز میں نے مولانا سے سوال کیا کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے شام میں دولتمندوں کے خلاف جو تحریک شروع کی۔ کیا اسے سوشلزم کی اساس نہیں قرار دیا جاسکتا۔ مولانا بے حد ناراض ہوئے اور حسب عادت مجھے مجلس سے اُٹھ جانے کا حکم ہوا۔ میں اٹھنے لگا مگر مولانا حفظ الرحمٰن نے مجھے اشارہ سے روک دیا۔ میں رُک گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس ناراضگی کا تدارک شروع ہوا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کہاں رہتا ہوں میں نے عرض کیا۔ میرٹھ۔ تو فرمایا۔ میرٹھ آؤں گا تو تمہارے یہاں ہی ٹھہروں گا۔

مفتی صاحب کی سادگی اور بے تکلفی کا ذکر کر رہا تھا۔ اس قسم کے کئی واقعات میرے ذہن میں ہیں مگر بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔

مفتی صاحب کی وضع داری:۔

مفتی صاحبؒ کی وضع داری بھی قابلِ ذکر ہے۔ جس سے ایک مرتبہ تعلقات ہو جاتے ان میں ذرا فرق نہ آتا۔

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے انتقال کے بعد جمعیۃ علمار ہند پر مولانا اسعد مدنی کا اقتدار قائم ہو گیا۔ مفتی صاحب عملی طور پر جمعیۃ سے بے تعلق ہو گئے تھے۔ میں جمعیۃ علمار ہند کی مجلس عاملہ کا رکن تھا۔ پھر دارالعلوم دیوبند کے حالیہ نزاعات میں میں اور مفتی صاحب مجلس شوریٰ میں مختلف صفوں میں تھے۔ مفتی صاحب پر اس کا اثر ہونا طبعی بات تھی۔ مگر ان کی وضعداری میں ذرا فرق نہ آیا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ میں ندوۃ المصنفین کے دفتر میں جاتا اور مفتی صاحب چائے پلائے بغیر اٹھنے دیتے بلکہ خود بہ نفسِ نفیس جاتے اور گھر سے جو قریب ہی تھا یا دفتر کے سامنے ہوٹل سے خود ٹرے میں چائے لے کر آتے اور باصرار پلاتے۔

مرض الموت کے آخری زمانہ میں جب پلنگ سے اٹھنے کی طاقت نہ تھی، میں بغرض عیادت گھر پہنچا۔ اندر بلا لیا گیا۔ دیکھا تو ناک پھول رہی تھی۔ چہرہ متورم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا۔ بات کرنی دشوار تھی۔

مگر باصرار بٹھایا۔ اہل خانہ کی خیریت معلوم کی اور وہیں چائے منگا کر پلائی۔

حضرت مفتی صاحب کے بہت سے اوصاف و کمالات حافظہ کے پردہ پر اُبھر رہے ہیں۔ مگر حالات کی ناسازگاری، طبیعت کی ناسازی اور وقت کی تنگی کی وجہ سے میں سلسلۂ بیان کو مجبوراً ختم کرتا ہوں۔ بہرحال

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

۲۴ر جون ۸۷ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت کی یاد آئی تو آتی چلی گئی

پروفیسر رضی الدین احمد ایم۔اے پی ایچ ڈی لٹ
ڈین علوم شرقیہ، سابق صدر شعبہ اُردو فارسی۔ ایس وی یونیورسٹی تروپتی آندھرا پردیش (جنوبی ہند)

میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جہاں علمائے دیوبند سے عقیدت اور ان کا احترام جزوِ ایمان بن گیا تھا چنانچہ جب میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اپنے ارگرد صحیح بخاری اور مسلم کی موٹی موٹی جلدوں کے ساتھ الامداد القاسم اور الرشید کے اُردو پرچوں کا ڈھیر بھی پایا۔ یہیں سے میں نے اردو کے مطالعے کی بسم اللہ کی۔ اس وقت اتنی سمجھ کہاں تھی کہ ان پرچوں میں علوم اسلامیہ کے جو بیش قیمت موتی بکھرے ہوئے تھے ان کو پرکھ سکتا۔ ان کے مضامین کو سمجھ سکتا۔ لیکن ان کی ورق گردانی کا یہ فیض بھی کیا کم تھا کہ ان چند لکھنے والوں کے نام میرے حافظے نے بچپن ہی میں محفوظ کر لئے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رح حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح بہت بعد کو اس کا علم ہوا کہ آخری دونوں بزرگ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کے عم محترم تھے۔ یہ وہ اکابر تھے جن سے میری عقیدت علم اور عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ یہاں اس دلچسپ واقعہ کا ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ میرے پردادا ابو حامد علی مرحوم متوفی ۱۹۰۴ء کی انگریزی عہد کے آغاز میں کسی انگریز سے دوستی ہوگئی تھی۔ اس دوستی کے طفیل انہیں انگریزی زبان کی شدبد ہوگئی۔ یہ زمانہ ایسا سخت اور حکومت کی تبدیلی کا سانحہ ایسا شدید تھا کہ مسلمانوں کو نہ صرف انگریزوں سے دشمنی تھی بلکہ انگریزی زبان سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی ایسی سخت نفرت تھی کہ اس کا سیکھنا بھی کرسٹان کہلائے جانے کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ کچھ دنوں تک میرے دادا مرحوم نے اپنی غلطی کو مصلحت کی چادر میں چھپائے رکھا لیکن بعد کو جب انہیں محکمہ نہر میں ایک سرکاری ملازمت مل گئی تو ایک نہ شد دو شد کے مصداق ان کے دونوں عیب کھل گئے۔ انگریزی پڑھنا اور انگریزی سرکار کی ملازمت کرنا دو ایسے عیب تھے کہ ایک نے دوسرے کا پردہ فاش کر دیا۔ نہ صرف عام مسلمانوں نے ان سے آنکھیں پھیر لیں بلکہ خاندان کے افراد اور ان کے اقربا بھی ان سے ملنے میں کترانے لگے۔ اس دن سے ہمارے خاندان کا نام ہی بابوجی کا خاندان کہلانے لگا۔ کچھ مدت کے بعد شاید پردادا کو بھی اپنے گناہ کا احساس ہوا، اس احساس کی شدت نے انھیں اس گناہ کے کفارے کی طرف مائل کیا۔ یہ تو ممکن نہ تھا کہ جو زبان سیکھ لی ہے اسے بھلا دیں اور یہ بھی آسان نہ تھا کہ اپنی سرکاری ملازمت ترک کر دیں۔ آخر ایک عالم دین نے ان کی مشکل کو حل کرنے کی ایک ایسی تدبیر سجھائی جو یہ کر گزرے۔ ان کے چار لڑکے تھے عالم دین نے کہا کہ آپ اپنے ایک لڑکے کو دیوبند بھیج کر عالم دین بنا دیں تو آپ کے گناہ کا کفارہ ادا ہو جائے گا۔ انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے محمد نصیر الدین کو اس غرض سے میرٹھ سے دیوبند بھیج کر دینی تعلیم دلائی۔ انہوں نے دیوبند میں درس نظامیہ کی تکمیل کی اور حضرت محدث گنگوہی مولوی رشید احمد سے حدیث کی سند لی۔ پھر بعد کو دہلی جا کر حکیم عبد المجید خاں سے طب کی تعلیم حاصل کی اور بجائے علم دین کے طب کو اپنا پیشہ بنایا۔

دیوبند کی تعلیم اور حضرت گنگوہی کے تعلق کی وجہ سے ہمارے گھرانے سے نہ صرف علمائے دیوبند کا تعارف تھا بلکہ اکابر علمائے دیوبند سے ایسا تعلق پیدا ہو گیا تھا کہ حضرت گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ ہمارے ہاں تشریف لاتے قیام فرماتے اور خاندان کے افراد کو اپنی خدمت کا موقع فراہم کرتے۔ میرے دادا مرحوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولوی حکیم نصیرالدین نے کوے کی حلّت کے بارے میں اپنے استاد حضرت گنگوہی کا ایک فتویٰ بھی شائع کیا تھا جس کی تائید اور تردید میں بہت سے کتابچے شائع ہوئے۔ افسوس کہ ان کا انتقال عین جوانی میں ہوا اور وہ سوائے ایک رسالہ فصل الخطاب کے اور کوئی تصنیف اپنی یادگار نہ چھوڑ سکے۔ میرے دادا کے انتقال پر میرٹھ میں شاید انہی کی یادگار میں مطبع قاسمی قائم ہوا۔ اور ایک عربی مدرسہ خادم العلوم۔

مولوی جلال الدین، قاری محمد اسحاق، مولوی ریاض الدین دادا کے ساتھیوں میں تھے۔ یہی حضرات مدرسہ کے معلم بھی تھے۔ قاری محمد اسحاق مفتی عزیز الرحمٰن کے خلیفہ تھے۔ میرے والد حکیم محمد ظہیر الدینؒ سے بڑی شفقت اور بہت اپنائیت کا تعلق رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب قاری اسحاقؒ کی طرح میرے والد مرحوم کا بھی احترام کرتے تھے۔ میرے عم محترم حکیم محمد بشیر الدین نے دینی تعلیم اسی مدرسہ خادم العلوم میں پائی تھی پھر دہلی کے طبیہ کالج سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ یہ حکیم اجمل خاں کے عزیز شاگرد تھے۔

مولوی بدر عالم میرٹھی چچا کے نہایت بے تکلف دوستوں میں تھے۔ مولوی بدر عالم میرٹھی حضرت محدث کشمیری مولانا انور شاہ کے عزیز شاگرد تھے۔ جب حضرت کشمیری نے دارالعلوم کو چھوڑ کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کا رُخ کیا تو اس شمع انوری کے پروانوں میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا حفظ الرحمٰن، مولوی بدر عالم اور مفتی عتیق الرحمٰن بھی شامل اور شریک تھے۔ عم مرحوم سے مولوی بدر عالم کی بہت بے تکلفی اور گہری دوستی تھی۔ دونوں کی دوستی میں مذہبی عقائد کے اشتراک کے علاوہ ایک قدر مشترک شکار کا شوق بھی تھا۔ چچا جان مرحوم کبھی کبھی کئی کئی دن اپنے مطب سے غائب رہتے تھے۔ یہ بات میرے والد مرحوم کو سخت ناپسند تھی اور وہ اس پر اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خفگی کا برملا اظہار بھی کرتے تھے۔ لیکن جب چچا جان مرحوم صفائی میں یہ فرماتے کہ میں مولوی بدر عالم کے ساتھ شکار کو گیا تھا تو والد مرحوم کی خفگی شفقت سے بدل جاتی تھی۔ شاید اس دوستی کا ایک تحفہ یہ بھی تھا کہ عم محترم نے اپنے بڑے صاحبزادے کا نام بھی مولوی بدر عالم کے نام سے مستعار لیا تھا۔

۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ آجانے پر ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ایک نئی ہلچل شروع ہو چکی تھی۔ انڈیا ایکٹ کی حمایت اور مخالفت میں پوسٹر شائع ہوتے تھے اور وہ اس وقت میرے قد سے بھی بڑے ہوتے تھے۔ میں اس وقت اُردو روانی سے پڑھ لیتا تھا محلہ کے ناخواندہ لوگ مجھ سے یہ پوسٹر پڑھوا کر سنتے تھے۔ کبھی پوسٹر دیوار پر اتنے اونچے لگائے جاتے تھے کہ پوسٹر پڑھنے کے لئے مجھے کسی کے کاندھے پر چڑھ کر انھیں پڑھنا ممکن تھا لوگوں کے کاندھے پر چڑھ کر پوسٹر پڑھتے وقت مجھے بچپن ہی سے اپنی بڑائی کا قبل از وقت احساس ہونے لگا تھا۔ میں نہ صرف روانی سے پوسٹر پڑھ کر لوگوں کو سناتا تھا بلکہ بیچ بیچ میں اپنی طرف سے یہ حاشیہ بھی چڑھاتا جاتا تھا کہ یہ بات صحیح ہے یہ بات غلط ہے۔ لوگ ہنس ہنس کر مجھے داد دیتے تھے اور میں خوش ہو ہو کر یہ داد وصول کرتا۔ اسی زمانے سے مجھے قومی تحریک سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ میری زندگی کا پہلا کھیل تھا، جسے میں نے اپنے بچپن میں اس طرح کھیلا جس طرح بچے گلی ڈنڈا یا کبڈی کھیلتے ہیں۔ آخر اسی شوق نے میری مخمل کی کامدار ٹوپی کو کھدر کی گاندھی ٹوپی سے بدل دیا۔ ۱۹۳۶ء میں پہلی بار میں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو میرٹھ میں دیکھا جن کا جلوس نکالا جا رہا تھا۔ جواہر لال کھدر کی وہی ٹوپی پہنے ہوئے تھے جسے عام طور پر کانگریس کے حامی استعمال کرتے تھے۔ اس وقت کانگریس اور مسلم لیگ میں اتحاد تھا۔ ۳۷ء کے انتخاب میں جب دوبارہ جواہر لال نہرو کو میں نے میرٹھ میں دیکھا تو وہ جلسہ گاہ میں اس طرح تشریف لائے تھے کہ ان کے ایک پہلو میں کانگریس کے امیدوار پنڈت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیارے لال شرما تھے اور دوسرے بازو میں مسلم لیگ کے امیدوار نواب محمد اسمٰعیل خاں ۔ اس وقت انتخاب جداگانہ نتھے۔ میں نے بھی نواب صاحب کی تائید میں چھوٹے چھوٹے جلسوں میں تقریریں کرنی شروع کر دی تھیں۔ اس زمانے میں علمائے دیوبند میں کچھ حضرات قومی تحریک کی حمایت کر رہے تھے اور کچھ علمائے کرام کا یہ عقیدہ تھا کہ ہندوستان میں تا قیام قیامت انگریزوں کی حکومت قائم رہے گی اس لئے قومی تحریک سے الگ رہنا ہی بہتر ہے۔

۲۷ء میں میں نے کلام پاک حفظ کر لیا تھا۔ اس وقت میری عمر دس برس کی تھی جب کوئی عالم یا رئیس والد کے مطب میں آتے اور میں اندر زنانے مکان میں ہوتا تو والد مجھے اندر سے بلواتے، والد مرحوم اپنے مخاطب سے فرماتے کہ یہ بندہ زادہ ہے۔ اس نے قرآن شریف حفظ کر لیا ہے۔ پھر مجھے حکم ہوتا کہ ایک رکوع سناؤ۔ میں ان کی تعمیل میں ایک رکوع پڑھ کر سناتا اور پھر آخر میں داد و تحسین پاتا۔ کبھی کبھی ملکہ وکٹوریہ کا چاندی کا روپیہ بھی انعام میں مل جاتا۔ میرٹھ میں اسی سال پہلی مرتبہ میری مفتی عتیق الرحمن صاحب سے ملاقات ہوئی۔

مفتی صاحب اس زمانے میں ندوۃ المصنفین کی تاسیس کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ اپنے خاص احباب سے اعانت اور تائید کے لئے گشت کر رہے تھے۔ مولوی بدر عالم اور مولوی حفظ الرحمٰن اس منصوبے میں ان کے رفیق و شریک تھے۔ مفتی صاحب مولوی بدر عالم اور بعض ذی علم حضرات کے ساتھ والد کے مطب میں تشریف لاتے۔ علماء کے اس مبارک اجتماع کو دیکھ کر والد مرحوم نے حسب معمول مجھے مکان سے بلوایا۔ علماء کے اس مبارک مجمع کے سامنے مجھے یہ کہہ کر پیش کیا کہ یہ بندہ زادہ ہے، اس نے قرآن شریف حفظ کر لیا ہے۔ پھر مجھ سے ایک رکوع پڑھنے کی فرمائش کی گئی اور میں نے بحسن و خوبی اس فرمائش کی تکمیل بھی کر دی۔ اب تک شروع سے یہ ہوتا آ رہا تھا کہ اس موقع پر مجھے داد دی جاتی میری تعریف کی جاتی اور میں بھی اس سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خوش ہوتا لیکن اس دن ایک ایسی غیر متوقع بات ہوئی کہ بجائے تعریف وتحسین کے مجھے ہدف ملامت بننا پڑا۔ ہوا یہ کہ جب میں مفتی صاحب اور مولوی بدر عالم کو قرآن شریف کا ایک رکوع سنا چکا تو قرأت ختم ہوجانے کے بعد مولوی بدر عالم نے میری ٹوپی کی طرف اشارہ کرکے طنزاً والد مرحوم سے کہا۔ حکیم صاحب یہ آپ کے صاحبزادے کے سر پر کیا ہے؟ والد مرحوم نے میری کھدر کی ٹوپی کو دیکھ کر بڑی سادگی اور سادہ لوحی سے جواب دیا حضرت ٹوپی ہے۔ یہ جواب سن کر مولوی صاحب پہلا وار طنزاً خالی گیا۔ مگر وہ بھی خاموش ہونے والے نہیں تھے۔ پھر والد صاحب سے فرمایا حکیم صاحب آپ کے اور ہمارے بزرگوں نے کبھی یہ ٹوپی اوڑھی ہے۔ والد صاحب یہ سن کر کچھ خاموش سے کچھ محجوب سے ہوئے تو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے مولوی بدر عالم سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ مولوی بدر عالم یہ گاندھی جی کی ٹوپی نہیں ہے۔ گاندھی جی نے حکیم اجمل خاں کو اس ٹوپی میں دیکھا تھا۔ اس کو کانگریس کے قومی لباس میں شامل کرلیا۔ دراصل یہ حامد کیپ ہے۔

یہ تھا مفتی صاحب سے میرا پہلا تعارف اور ان سے میری اوّلین ملاقات۔ مفتی صاحب کی اس تائید اور ترجمانی سے والد مرحوم کی مشکل بھی آسان ہوئی اور میری بھی ہمت بندھی۔ پہلا تاثر عموماً بہت گہرا اور گہرا سا یہ ہوتا ہے۔ اس کی گرمی اور یہ گداز اب بھی میرے احساس میں شامل اور شریک ہے۔ مجھے یہ اندازہ ہوگیا کہ مفتی صاحب عام علماء سے الگ اپنا ایک مزاج رکھتے ہیں جس میں چھوٹوں سے شفقت، ہم عمروں اور ہم خیالوں سے اپنائیت، بزرگوں سے عقیدت اور اپنے مخالفوں سے خاطر و مدارات، ان کی طبیعت کے اہم اساسی عناصر تھے۔ معتبر اور محترم اساسی عناصر۔

۱۹۳۷ء کے پہلے صوبائی انتخابات میں کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ کے بھی بہت سے امیدوار کامیاب ہوئے۔ اس سال جب پہلی بار صوبائی سطح پر کانگریس کی وزارتیں بنیں تو یوپی میں کسی مسلم لیگ کے امیدوار کو وزارت میں نہیں لیا گیا۔ یہیں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کانگریس اور مسلم لیگ میں شدید اختلافات کا آغاز ہوا اور کانگریس کی وزارتیں بننے کے بعد اس اختلافات نے بڑی شدت اختیار کر لی اور بہت سے شبہات نے خطرناک راہ پائی۔ میری دلچسپیاں شروع ہی سے کانگریس کے ساتھ تھیں اور یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ اکثر علمائے دیوبند بھی اس سیاسی مسلک کے پیرو تھے۔ ۱۹۳۸ء میں ندوۃ المصنفین کے منصوبے نے عملی شکل اختیار کر لی مفتی صاحب اپنی تنظیمی صلاحیتوں اور تعمیری رجحانات کی وجہ سے اس ادارہ کے منتظم اعلیٰ قرار پائے۔ ان کے رفیقوں اور ہمدموں میں مولانا حفظ الرحمٰنؒ مولوی بدر عالمؒ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ جیسے اکابر اور اعلیٰ ذہن رکھنے والے بزرگ شامل تھے۔ ادارہ کا ترجمان برہان نکلنے لگا جس کے مدیر اعلیٰ مشہور عالم دین مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ تھے۔

ادارہ کا ترجمان کیا بلحاظ صورت اور کیا بلحاظ سیرت میرے خیال میں الامداد القاسم اور الرشید ہی کی ترقی یافتہ شکل تھا۔ ۳۷ء سے ۴۰ء تک کانگریس اور مسلم لیگ کا اختلاف اتنا شدید ہو گیا تھا کہ ملک کی آزادی کی راہ میں مسلم لیگ ایک بہت بڑی رکاوٹ بن کر ابھر آئی۔ یہ برطانوی حکمت عملی کا ایک ایسا حربہ اور حملہ تھا جس نے آخر ملک کی تقسیم کا نعرہ اور نظریہ بن کر ملک کی سیاست کی بساط ہی پلٹ دی۔ مجھے اس زمانہ سے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا احمد سعید، سید شاہ عطاء اللہ بخاری اور استاذی حضرت عبیداللہ سندھی سے بڑی عقیدت اور بڑی قربت ہو گئی تھی۔ میں قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد عربی مدرسہ میں عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ یہ حضرات عربی مدارس کے جلسوں میں تشریف لاتے تھے اور ان کے مواعظ اور تقاریر نے مجھے اس درجے متاثر اور مسحور کر دیا تھا کہ میں نے بھی چھوٹے چھوٹے جلسوں میں تقریر کرنے کی مشق شروع کر دی تھی جو چند سال میں مہارت بن گئی۔ اب مجھے بھی بڑے بڑے جلسوں میں تقریر کرنے کا خبط سا ہو گیا۔ خطبی اور خطیب ملت میں بہت جلد مقبول اور مقرب ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ یہی سانحہ ہوا جسے میں نے سعادت سمجھا۔

© rasailojaraid.com